مسائل جدیدہ کے حل میں علماء کرام کی خدمات کا جائزہ

☆محمد شہاب اشرف خٹک

Abstract

Islam is a complete code of life, which provides the solution of all problems of individual and collective life Human being. there are two sources of Islamic Shariah i.e Al-Quran and Hadith. These sources are so complete and applicable that no issue of human life is remianed which has not been discussed in said sources. By the passage of time different issues in econoimic, Social, moral and political systems are being raised. Therefore the Muslim scholars presented the solution of new issues and problems of society in the light and spirit of Islamic sources of Shariah. In this article the new and core buring issues of the society are described. The Muslim scholars of present age presented the solution of such probelems according to Islamic Shariah. The contributions of religious scholars in this regard are very effective and remarkable, which are also mentioned in this article.

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر پیش آمدہ مسئلہ کا حل فطری طریقے کے مطابق پیش کرتا ہے۔قرآن اور حدیث سے استنباط کرتے ہوئے عصر حاضر کے جید علماء کرام نے بہت سے جدید مسائل کا حل روح اسلام کے مطابق پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

سفر انسانی زندگی کا ناگزیر امر ہے۔ ہر انسان کو زندگی کے مختلف مواقع پر اس سے واسطہ درپیش ہوتا ہے۔اسلام ایک کامل دین ہے اس نے اس مرحلہ کی بھی کامل رہنمائی پیش کی ہے جو مسائل ایک مسلمان کو دوران سفر پیش آسکتے ہیں۔ان مسائل کی بابت علماء کرام کی آراء کا تحلیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

سفر کے دوران قصر کرنا اور عصر حاضر میں ہوائی سفر کے دوران نماز کی ادائیگی کی بابت مختلف علماء کرام کی

☆پی ایچ ڈی سکالر،شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان

آراء پیش کی گئی ہیں۔

سفر کے لغوی و شرعی معنی حسب ذیل ہیں:

فی اللغة الخروج المدید،فی شریعة قصد المسافة المخصوصة هی مسافة ثلثة ایام و لیالیها بسیرو سبط(۱)

ترجمہ: سفر کا لغوی معنی ہے لمبا نکلنا،اور شریعت میں مخصوص مسافت (سفر) کا قصد کرنا۔مخصوص مسافت سے مراد درمیانی چال کے ساتھ تین دن اور تین راتوں کا سفر۔اس سلسلے میں فقہاء کرام اور موجودہ دور کے علماء کے اقوال مختلف ہیں۔

مفتی رشید احمد بیان کرتے ہیں کہ:

امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر علماء کرام کی آراء یہ ہے کہ کم از کم چار برید کی مسافت ہونی چاہئے۔(۲)

اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تحقیق کے مطابق ایک برید ۱۲ میل کا ہوتا ہے لہذا چار برید ۴۸ میل کے ہونگے۔(۳)

یہ کہ ۴۸ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد مسافر قصر کرے گا۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی:۱۹۰۵ء) بیان کرتے ہیں کہ:

صحیح مسافت قصر چار برید، 16,16 میل کی تین منزلیں ہوتی ہیں اور امام مالک نے جو حدیث موطا میں بیان کی ہے اس سے ثابت ہوتی ہے۔مگر مقدار میل مختلف ہے۔لہذا تین منزل جامع سب اقوال کو حاوی ہو جاتی ہے۔اگر اسٹیشن اس شہر میں داخل ہے تو داخل ہے اور اگر اس کے اندر داخل نہیں تو مقرر کرے گا۔اور جو نمازیں پہلے پڑھی گئیں ان کے اعادہ کی حاجت نہیں۔اسٹیشن شہر میں داخل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ریل گاڑی شہر میں سے ہو کر جاتی ہے۔پس مسافر وہاں اسٹیشن پر قصر نہیں کرے گا اور مدار نظر آنے پر نہیں بلکہ دخول پر ہے۔(۴)

مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (متوفی ۱۳۴۷ھ) کی رائے ہے:

تین دن کی مسافت اور تین مراحل کا تعین بعض علماء کرام نے انگریزی میل کے لحاظ سے ۴۸ میل کیا ہے۔اور مسافر یہ مسافت طے کرنے کے بعد قصر کرے گا۔(۵)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی رقم طراز ہیں کہ:

احناف کے ہاں میلوں کی تعین کے معتبر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تین دن رات کی مسافت جو اصل

مذہب ہے وہ راستوں کے اختلاف سے مختلف ہوسکتی ہے کیونکہ صاف راستہ پر اگر انسان ایک دن میں سولہ میل چل سکتا ہے تو دشوار گزار راستہ میں تو ۱۲ میل مشکل سے طے کر سکے اور پہاڑی راستوں میں آٹھ یا نو میل طے کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے میلوں کی تعین مناسب نہیں بلکہ جیسا راستہ ہو اس کے حساب سے جس قدر میل با آسانی تین دن میں طے ہوں وہی مسافت قصر ہے لیکن تین دنوں کے سفر کا تعین ہر شخص کے لیے دشوار ہے اس لیے علماء کرام نے ۴۸ میل پر فیصلہ کیا ۴۸ میل سے کم پر مسافت پر قصر شمار نہ ہوگا اور نہ قصر کی گنجائش ہوگی یہ مسافت نہ صرف عام سواریوں میں بلکہ تیز رفتار سواریاں جیسے ٹرین، بس، موٹر کار، ہوائی جہاز اور سمندری جہاز سب کے لیے یکساں ہیں اگر چہ یہ مسافت ان کے ذریعے کتنے ہی کم وقت میں کیوں نہ طے کیا جائے سفر شمار ہوگا اور مسافر کو نماز قصر کی گنجائش ہوگی۔(۶)

تصنیف کنز الدقائق سے مترجم مولانا محمد احسن صدیقی لکھتے ہیں:

کہ جو شخص درمیانی چال سے تین دن کا سفر کرے یعنی تین منزل طے کرنے کے ارادے سے روانہ ہو کر اپنے شہر کی آبادی سے نکل جائے خواہ وہ سفر خشکی کا ہو یا دریا کا یا پہاڑ کا وہ چار فرضوں کو دو میں ادا کرے گا۔ مزید یہ کہ تین روز سے کم کے سفر میں جو تقریباً چھتیس کوس کا ہوتا ہے یا اس سے کم میں نماز قصر ادا نہ کی جائے۔(۷)

سفر کے دوران وضو کیلئے پانی نہ ملے تو مسافر کیا کرے گا؟

ابی الحسنات مولانا محمد عبدالحئیؒ (متوفی:۱۳۰۴ھ) رقم کرتے ہیں کہ:

مسافر جب اپنی منزل سے نکلتا ہے اور وہ جب ایک میل کا سفر طے کر لیتا ہے اور اس دوران نماز کا وقت ہو جاتا ہے اور پانی نہیں ملتا تو وہ اس ایک میل کی مسافت طے کرنے کے بعد تیمّم کر سکتا ہے۔(۸)

تو اس ضمن میں مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسریؒ (متوفی:۱۹۴۳ء) رقم طراز ہیں کہ:

جیسا کہ سفر میں فرض کو قصر کرنا تو لازم ہے یعنی چار کو دو رکعت میں ادا کرے گا اور جہاں تک سنتوں کا مسئلہ ہے تو اس میں تاکید کم ہو کر بطور نفل رہ جاتی ہے۔ پڑھے تو ثواب ہے اور اگر نہ پڑھے تو گناہ نہیں۔ (۹)

اس ساری بحث کو مدنظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کرام نے مسافت قصر کا تعین کر دیا ہے کہ جو مسافر سفر پر نکلے گا اور اپنے شہر سے دور موجودہ انگریزی حساب سے ۷۸ کلومیٹر طے کر لے گا۔ تو اب اس پر لازم ہے کہ وہ سفر کی حالت میں قصر کرے گا یعنی چار رکعت والی نماز کو دو رکعت میں ادا کرے گا۔

ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے سے نماز ہو جاتی ہے؟

اسلامی عبادات میں نماز ایک ایسی عبادت ہے جس کا ادا کرنا تمام مکلفین پر فرض ہے۔ اگر کوئی مسافر

ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہے اور نماز کا وقت آ جاتا ہے تو اس وقت وہ نماز ادا کرے تو کیا اس کی نماز ہو جائے گی۔

تو اس ضمن میں علماء کرام نے یہ آراء دی ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز میں صرف دو صورتوں میں نماز پڑھنا ممکن ہے۔

۱۔　ہوائی جہاز میں بغیر کسی عذر کے نماز بیٹھ کر پڑھنا

۲۔　عذر اور مجبوری کی وجہ سے جہاز میں نماز پڑھنا

تو ان دو صورتوں کو بیان کرنے کے بعد دوسری صورت کی وضاحت کرتے ہوئے **مولانا رشید احمد لدھیانوی** بیان کرتے ہیں کہ

کہ ہوائی جہاز بوقت پرواز چلتے ہوئے بحری جہاز کی طرح ہے یعنی اس میں بوجہ عذر نماز پڑھنا جائز ہے۔(۱۰)

اور پہلی صورت کے ضمن **مولانا برہان الدین سنبھلی** وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ

جب کوئی عذر لاحق نہیں اور جہاز بھی زمین پر ہے تو اس حالت میں بالاتفاق نماز صحیح ہے تاہم اگر نیچے اترنے کی گنجائش ہے تو نیچے اتر کر نماز ادا کی جائے تا کہ ارکان نماز کامل طور پر ادا ہو سکے اور اگر ہوائی جہاز ابھی تک زمین پر کھڑا ہے اور مسافر جہاز پر چڑھ جائیں اور نماز کا وقت آ گیا ہے اور جہاز مزید وقت کے لیے اگر رکا ہوا ہے تو پھر بھی افضل یہ ہے کہ مسافر جہاز سے نیچے اتر کر نماز ادا کرے اور اگر اترنے اور نماز کو ادا کرنے کے وقت میں جہاز کے اڑنے کا وقت ہو جاتا ہے تو اس خطرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مجبوراً وہ جہاز کے اندر نماز ادا کرے۔(۱۱)

مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۹۴۳ء) کی رائے یہ ہے کہ:

اس مسئلہ کا حاصل جواب یہ ہے کہ جن عذروں کے سبب اونٹ، گھوڑے وغیرہ پر نماز پڑھنا جائز ہے اور اگر وہی عذر یہاں پائیں جائیں کہ مثلاً اترنے میں خوف ہلاکت وغیرہ ہو یا اترنا اس کے بس میں نہ ہو یا پھر جہاز کے اڑنے کا وقت قریب ہو تب تو ایسے عذر میں نماز پڑھنا جائز ہے اور اگر کوئی عذر نہیں تو پھر جہاز میں نماز پڑھنا جائز نہیں۔(۱۲)

قبلہ رخ ہو کر اور سجدہ کی حالت پیشانی ٹیکنا جیسی صورتوں میں جہاز میں نماز کا کیا حکم ہے؟

تو اس ضمن میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی بیان کرتے ہیں کہ:

زمین کی طرح ہوائی جہاز پر بھی نماز ادا کی جا سکتی ہے اس لیے شریعت نے نہ صرف خانہ کعبہ بلکہ اس کے مقابل آنے والی پوری فضا کو قبلہ کا درجہ دیا ہے تا کہ اونچی سے اونچی اور بلند سے بلند جگہ سے بھی نماز ادا کی

جا سکے۔لہذا ہوائی جہاز چاہے کتنی بلندی پر پرواز کر رہا ہے مسافر جہاز کے اندر جس طرح منہ کر کے بیٹھا ہے اسی طرف وہ نماز ادا کر سکتا ہے اور دوسری بات یہ کہ سجدہ کی حالت میں پیشانی کا ٹیکنا۔تو جہاز میں یہ بات نہیں پائی جاتی تو اس قسم کے تکلفات واقعہ ہے کہ شریعت کی روح سے ہم آہنگ نہیں ہیں یہ بالکل ایک اتفاقی بات ہے کہ چونکہ عام طور پر زمین پر ہی پیشانی ٹیکنے کی نوبت آتی ہے۔اس لیے فقہاء نے زمین (ارض) کا لفظ کا استعمال کیا ہے یہ ٹھیک اسطرح ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ روئے زمین پر اسلام سے بہتر کوئی دین نہیں تو کیا اس سے یہ بات سمجھی جائے گی کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ چاند پر اس سے بہتر ایک اور دین موجود ہے؟ دراصل شریعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز ہو جس پر انسان کی پیشانی ٹک سکے جیسا کہ کشتی میں نماز کی اجازت ہے حالانکہ سطح زمین اور کشتی کے درمیان پانی کا ایک بے پناہ فاصلہ موجود ہے۔لہذا ہوائی جہاز پر اس طرح نماز ادا کی جائے تو وہ نماز اس طرح درست ہے جیسا کہ زمین پہ ہوتی ہے۔(۱۳)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ (متوفی ۱۹۷۶ء) مذکورہ مسئلہ کے ضمن میں بیان کرتے ہیں کہ:

جب تک ہوائی جہاز زمین پر کھڑا ہے یا زمین پر چل رہا ہے اس وقت تک وہ ریل کے حکم میں ہے اور اس پر نماز بلا اتفاق جائز ہے لیکن جب وہ پرواز کر رہا ہو تو اس حالت میں بغیر کسی عذر کے نماز جائز نہیں۔مفتی محمد شفیع یہ عذر بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر خطرہ ہو کہ جہاز کے منزل پر پہنچنے تک نماز کا وقت ختم ہو جائے گا تو اس مجبوری کے باعث وہ جہاز میں نماز ادا کر سکتا ہے۔ورنہ اور کسی صورت میں نہیں۔(۱۴)

مختصر یہ کہ اس مسئلہ کے ضمن میں علماء کرام کی آراء ہے کہ سجدہ زمین پر پیشانی ٹیکنے سے نماز درست ہو سکتی ہے تو جہاز میں یہ بات نہیں پائی جاتی اور علماء کرام کے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے کہ نماز کی ادائیگی صحیح طور پر ہو یعنی اس کے تمام ارکان احسن طریقے سے ادا ہو سکیں خاص کر سجدہ کے وقت پیشانی کا سطح زمین پر ٹیکنا اور جہاز میں چونکہ سجدہ کرنے کی جگہ میسر نہیں ہوتی۔اس لیے وہ اس بات پر زور دے کر فرماتے ہیں کہ بغیر کسی عذر کے ہوائی جہاز پر نماز نہیں ہوتی۔ لیکن موجودہ ترقی یافتہ دور میں ہوائی جہاز کی اندرونی ساخت اس قسم کی بنائی گئی ہے ایک تو سفر آرام دہ ہو گیا ہے۔اور وہاں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ مسافر اگر یہ بات محسوس کرے کہ ہوائی جہاز کے اترنے تک نماز کا وقت نکل جائے گا تو اس خدشہ کے باعث وہ ہوائی جہاز میں نماز ادا کر سکتا ہے۔

روزے کی حالت میں انجکشن لگوانا:

اسلامی عبادات کا تیسرا رکن روزہ ہے اور روزہ ایک ایسی بدنی عبادت ہے جس کا تعلق جسم کے ساتھ ہے اور اپنے آپ کو بھوکا، پیاسا رکھنا ہوتا ہے اور ساتھ یہ کہ ہر قسم کی لغویات باتوں اور فضول کاموں سے خود کو روکنا

ہوتا ہے۔ روزہ رکھنے سے انسان متقی بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ بھوکا، پیاسا، صبح سحر سے لے کر شام (مغرب) تک رہنا پڑتا ہے تو اس سے دوسروں کے لئے احساس پیدا ہوتا ہے جو بھوکے پیاسے نادار لوگ ہوتے ہیں اور اس طرح صبر اور حوصلہ کی تعلیم پاتا ہے اور پھر ایسا وقت آجائے کہ سخت مشکلات ہوں اور انسان کو ۱۵ یا ۱۶ گھنٹے بھوکا رہنا پڑے اور وہ روزہ دار ہو تو ایسی صورت حال میں برداشت کر سکے گا۔

روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ روزہ دار کو روزہ کا بدلہ اللہ تعالیٰ خود دے گا۔

بہر حال یہ اہم عبادت ہے اور اس کے مسائل و احکام فقہاء حضرات اور علماء کرام نے مفصلاً وضاحت کے ساتھ بیان کیے۔ یہاں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ ایک روزہ دار کو اگر کسی وقت تکلیف ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انجکشن لگوانا پڑ جائے تو کیا وہ روزے کی حالت میں انجکشن لگوا سکتا ہے اور اس کا روزہ فاسد تو نہیں ہوگا؟

الصوم کے لغوی اور شرعی معنی:

مطلق الامساک. فی الشرع: عبارہ من علی امساک مخصوص. وھو الامساک عن الاکل والشرب والجماع من الصبح الیٰ مغرب مع النیة (۱۵)

ترجمہ: لغت میں صوم سے مراد مطلق رُکنا ہے۔ اور شریعت اسلام میں مخصوص نیت کے ساتھ صبح سے لے کر مغرب تک مخصوص رکنے کا نام ہے۔ اور وہ کھانے پینے اور جماع سے رکنا ہے۔

اس ضمن میں علماء کرام نے جو آراء دی ہے وہ بیان کی جاتی ہیں

مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی: ۱۹۴۳) رقم طراز ہیں کہ:

ڈاکٹر کی تحقیق اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انجکشن کے ذریعے دوا جوف عروق میں پہنچائی جاتی ہے اور خون کے ساتھ شریانیں یا اوردہ میں اسکا سریان ہوتا ہے۔ جوف دماغ یا جوف بطن میں دوا نہیں پہنچتی۔ لہٰذا انجکشن لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ (۱۶)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ (متوفی: ۱۹۷۶ء) رقم طراز ہیں کہ:

کسی چیز کا بدن کے کسی حصے کے اندر داخل ہو جانا مطلقاً روزہ کو فاسد نہیں کرتا۔ انجکشن کے ذریعے بلا شبہ دوا یا اس کا اثر پورے بدن کے ہر حصے میں پہنچ جاتا ہے مگر یہ پہنچنا منفذ اصل کا راستہ نہیں بلکہ عروق (رگوں) کے راستہ سے یہ راستہ منفذ اصل نہیں ہے۔ اس لیے کہ گرمیوں کے موسم میں کوئی شخص ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا

ہے تو پیاس کم ہو جاتی ہے کیونکہ پانی کے اجزاء مسامات کے راستے سے اندر جاتے ہیں مگر اس فعل کو کسی نے مفسد صوم نہیں قرار دیا۔ تو اس بات سے یہ شبہ جاتا رہا کہ گلوکوز یا دوا وغیرہ کا انجکشن لگانا ایسے ہیں کہ ان کے ذریعے بدن کو غذا جیسی قوت پہنچائی جا سکتی ہے اس لیے ان کا حکم غذا کا سا ہونا چاہیے؟ تو اس کا جواب واضح ہے کہ قوت پہنچانا مطلقاً مفسد صوم نہیں ہے جیسے ٹھنڈک پہنچانا مفسد صوم نہیں ہے بلکہ منفذ اصلی کے راستہ سے کسی چیز کا جوف معدہ یا دماغ میں پہنچنا منفذ ہے۔ وہ انجکشن میں نہیں پایا جاتا اگر قوت اس سے پہنچ جائے۔ (۱۷)

مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری (متوفی: ۱۹۱۹ء) لکھتے ہیں:

انجکشن کے ذریعے روزہ کی حالت میں دوا یا غذا کو جسم میں پہنچانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ (۱۸)

مولانا مفتی محمودؒ (متوفی: ۱۹۸۰ء) کا قول نقل کیا گیا ہے:

روزہ اس چیز سے فاسد ہوتا ہے جو کسی منفذ کے ذریعہ معدہ یا دماغ تک پہنچ جائے۔ انجکشن میں دوا بذریعہ منفذ نہیں جاتی بلکہ عروق اور مسامات کے ذریعہ جسم اور معدہ میں پہنچتی ہے۔ لہٰذا کسی قسم کا انجکشن لگوانے سے روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ (۱۹)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ (متوفی: ۲۰۰۰ء) بیان کرتے ہیں کہ:

روزہ کی حالت میں اگر کسی مریض کو انجکشن لگا دیا جائے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ (۲۰)

صاحب جامع الفتاویٰ رقم طراز ہیں کہ:

مفسد صوم وہ چیز ہے جو جوف معدہ یا دماغ تک پہنچ جائے اور وریدی (رگ) انجکشن کے ذریعے جو دوا پہنچائی جاتی ہے وہ رگوں کے اندر رہتی ہے جوف معدہ یا دماغ تک نہیں پہنچتی اور اس کو ناک یا منہ میں ڈالی جانے والی دوا پر قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ ان میں ڈالی جانے والی دوا براہ راست جوف تک پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا حاصل یہ کہ رگ کے ذریعے انجکشن کرانے سے روزہ مفسد نہیں ہوتا''۔ (۲۱)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی تحقیق ہے کہ:

انجکشن کے ذریعے جو چیزیں جسم میں داخل کی جاتی ہیں وہ عموماً رگوں کے ذریعے قلب و دماغ یا معدہ تک پہنچتی ہیں اور ایک ایسی راہ سے گزرتی ہیں جو اس کی تحقیق کی راہ اور فقہاء کی زبان میں ''منفذ'' نہیں ہے۔ تو فقہاء ایسی چیزوں کو مفسد صوم قرار نہیں دیتے۔ لہٰذا علمائے کرام کے نزدیک انجکشن کے ذریعے چاہے خون پہنچایا جائے یا دوا تو وہ مفسد صوم نہیں ہوگا۔ اور اگر گلوکوز وغیرہ چڑھایا جائے تو اسکی نوعیت بھی یہی ہے کہ روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ (۲۲)

تمام علماء کرام کی آراء سے واضح ہوتا ہے کہ اگر روزہ کی حالت میں روزے دار کو اچانک تکلیف ہو جائے یا پہلے سے کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے کہ اس کو روزانہ انجکشن لگوانا پڑتا ہے اور وہ روزہ بھی رکھنا چاہتا ہے تو ان دونوں صورتوں میں انجکشن لگوانے سے اس کا روزہ مفسد نہیں ہوگا۔

لیکن موجودہ زمانے اور نئی نئی تحقیقات کے پیش نظر اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ روزہ کی حالت میں خصوصاً ایسے امور میں احتیاط کرنا چاہیے کہ جس سے دل میں شک وشبہ آئے۔

ضبط ولادت (بچوں کی روک تھام) کی شرعی حیثیت:

اسلام جامع دین ہے۔ اس کے اصولوں کو کسی انسان نے نہیں بنایا بلکہ کائنات کے واحد مالک اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنایا ہے، جس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کا کوئی نظریہ ایسا نہیں جو عقل وخرد کے کسی تقاضے سے ٹکرایا ہو۔ شرع اسلام کا اصل مدار کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اللہ پاک نے انسان کو دو انسانوں کے جنسی ملاپ سے پیدا کیا ہے۔ نر اور مادہ کے اس جنسی ملاپ سے پوری نسل کو چلایا ہے۔ اور پھر یہ اختیار کسی کو نہیں دیا کہ وہ نسل چلانے کے عمل کو روک دے۔ کیونکہ اہلِ عرب کے بعض جاہل قبائل جو فقر و فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ پھر زمانۂ حال میں جاہلیت قدیمہ نے سر اُٹھایا اور کثرت آبادی اور معاشی تنگدستی کا شور کر کے فیملی پلانگ (Family Planning) یا ضبط ولادت کے عمل کو مختلف صورتوں میں جواز بنا کر پیش کیا۔

ضبط کے معنی روکنا:

لسان العرب میں ہے:

ضبط : " الضبط لزوم الشی و حسبه" (۲۳)

ترجمہ۔ ضبط ولادت سے مراد پیدائش کا رد کرنا۔

دور حاضر میں اس سے مراد زندگی میں مصنوعی اور غیر فطری طریقے اختیار کر کے شرح ولادت کو کم کرنا تاکہ آبادی اور وسائل کے درمیان توازن قائم کر کے زندگی کو خوشحال بنایا جا سکے۔ لہٰذا اس مسئلہ کے ضمن میں علماء کرام نے اس کو ناجائز قرار دیتے ہوئے جو اپنی آراء دی ہیں وہ ذیل میں بیان ہیں:

شمس الائمہ سرخسی حنفیؒ (متوفی:۴۸۳ھ) کی رائے: **"ثم المآء فی الرحم ما لم یفسد فهو معد للحیاة فیجعل کالحی فی ایجاب ذالک الضمان باتلافه کما یجعل بیض الصید فی حق المحرم کالصید فی ایجاب الجزاء علیه بکسره" (۲۴)**

ترجمہ۔　مادہ منویہ رحم میں جب تک فاسد نہ ہو اس وقت تک زندگی قبول کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو ہلاک کرنے پر تاوان واجب کئے جانے کے مسئلہ میں وہ زندہ وجود کی طرح ہے، جیسا کہ محرم (احرام کی حالت میں) شکار کا انڈہ پھوڑ دے تو وہ جزا واجب ہونے کے حق میں خود شکار کے درجہ میں ہے۔

امام محمد بن احمد غزالیؒ (متوفی: ۵۰۵ھ) کی رائے:

انسانی وجود کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ نطفہ رحم میں داخل ہو کر عورت کے مادۂ تولید کے ساتھ مل جاتا ہے اور پھر وہ انسان بننے کی حالتوں میں تبدیل ہوتا رہتا ہے تو ایسی حالت میں اس کو ختم کرنا گناہ ہے۔ (۲۵)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی: ۱۱۷۶ھ) کی رائے:

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع (سوشل) بنایا ہے اور اس کا ارادہ انسانی نسل کے بقاو فروغ کا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی شریعت میں نسل بڑھانے کی بہت ترغیب دلائی گئی ہے اور قطع نسل سے اور ایسے اسباب اختیار کرنے سے جس سے قطع نسل سے تقلیل نسل ہو سخت منع کیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب ''عزل'' (جیسی غیر یقینی بلکہ موہوم منع حمل کی تدبیر) کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **"ما علیکم الا تفعلوا"** (تم پر یہ لازم نہیں ہے) میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں کراہت اور ناگواری کا اشارہ ملتا ہے۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ شخصی مصلحت کا جب ٹکراؤ ہو تو عمومی مصلحت کو ترجیح دی جاتی اور شخصی مصلحت قربان کر دی جاتی۔ عزل (منع حمل) میں اگرچہ اس شخص کا تھوڑا سا فائدہ ہے اگرچہ موہوم فائدہ ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ شخصی اخراجات اور زیادہ کمانے کی مشقت سے بچ جائے لیکن (نسل انسانی کے فروغ میں رکاوٹ پڑ جانے کی وجہ سے) عمومی نقصان ہے اور اللہ تعالیٰ کے عام احکام میں ہمیشہ عمومی مصلحت کو ترجیح حاصل ہوتی ہے بہ نسبت انفرادی مصلحت کے۔ شاہ ولی اللہ کی اس مفصل رائے کا صاف معنی یہ ہے کہ ضبط ولادت کے ذرائع کا استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ (۲۶)

سید مودودیؒ (متوفی: ۱۹۷۹ء) کی رائے:

دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے اسلام صرف ایک ہی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رزق کے جو ذرائع پیدا کئے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جو ذرائع اب تک مخفی ہیں ان کو دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔ آبادی روکنے کی ہر کوشش خواہ وہ قتل اولاد ہو یا اسقاطِ حمل یا منع حمل یہ غلط اور بے حد تباہ کن ہے۔ اور اس سے چار نتائج ایسے ہیں جن کو رونما ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جاسکتا۔

۱۔ زنا کی کثرت۔

۲۔ انسان کے اندر خود غرضی اور معیارِ زندگی بڑھانے کی خواہش اس حد تک بڑھ جائے گی کہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ اور یتیم بہن بھائیوں اور دوسرے محتاج امداد رشتہ داروں کا وجود بھی ناگوار گزرنے لگے گا۔

۳۔ اور پھر ایسے حالات ہوجائیں گے کہ شرح پیدائش شرح اموات سے کم تر ہوجائے گی۔

۴۔ قومی دفاع کا کمزور ہوجانا اور یہ حالت خصوصی طور پر ایک ایسی قوم کے لئے بے حد خطرناک ہے جو اپنے سے کئی زیادہ آبادی میں گھری ہوئی ہے۔ بہرحال یہ فعل انتہائی ناقابلِ معافی جرم ہے۔(۲۷)

مولانا محمد برھان الدین سنبھلیؒ کی رائے:

بعض شخصی عذر مثلا شدید بیماری یا ہلاکت کے خوف سے افراد کے لئے وقتی طور پر حمل کو روکنے کی کچھ تدابیر تو جائز ہیں لیکن خاندانی منصوبہ بندی کے طریقہ سے مکمل طور پر افزائش نسل میں رکاوٹ ڈالنا بالکل ناجائز ہے۔اسی طرح شخصی طور پر بھی موہوم یا غیر اہم خطرات کی بناء پر یا معمولی منافع اور سہولتوں کی توقع پر نسل انسانی کے اضافہ سے بچنے کی ارادی کوششوں کی بعض شکلیں شرعاً مکروہ اور ناپسندیدہ ہیں اور بعض قطعاً حرام ہیں فقر وفاقہ یا افلاس کے خوف سے بھی تقلیل نسل کی کوششیں شرعاً ممنوع ہیں۔ (۲۸)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ (متوفی:۲۰۰۰ء) فرماتے ہیں:

۱۔ خاندانی منصوبہ بندی کی جو تحریکیں آجکل عالمی سطح پر چل رہی ہیں ان کے بارے میں تو علماء امت فرما چکے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔البتہ کسی عذر کی حالت میں جبکہ ڈاکٹر کے نزدیک عورت مزید بچوں کی پیدائش کے لائق نہ ہو تو علاج کی غرض سے ضبط ولادت (حمل کی روک تھام) کا حکم دیا جاسکتا ہے۔

۲۔ وضع حمل کی تدبیر اگر بطورِ علاج کے ہو کہ عورت کی صحت برداشت نہیں کرسکتی تو بلا کراہت جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔اور اس نیت سے خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کو کنڑول کیا جائے تو شرعاً گناہ ہے۔

۳۔ اور یہ کہ عورت کا بچہ پیدا کرنا فطری عمل ہے اور جو عورتیں اس فطری عمل کو روکنے کی کوششوں کو اختیار کرتی ہیں تو وہ اپنی صحت بھی خراب کرلیتی ہیں یعنی بلڈ پریشر سے لے کر کینسر تک کی بیماریوں کا شکار ہوجاتی ہیں اور آخر کار قبر تک جا پہنچتی ہیں۔

۴۔ ضبط ولادت کی ہر قسم کی گولیاں یا دوسری تدابیر اختیار کرنا ایک زہر کا کھانا ہے جو جسم میں اتارا جاتا ہے۔ (۲۹)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی رائے ہے:

نسل انسانی کو روکنے کے لئے یا بچوں کی تعداد میں کمی کی غرض سے موجودہ زمانے میں بعض مخصوص قسم کے جور براستعمال کئے جاتے ہیں ان ربر کی ٹوپیوں میں ایک تو وہ ہوتی ہیں جسے مرد خود اپنے عضو تناسل پر چڑھا لیتا ہے۔اس کو''نرودھ'' کہتے ہیں۔دوسرے وہ جسے عورت اپنے رحم کے منہ پر ڈال لیتی ہے تاکہ مادہ اس کے اندر داخل نہ ہو سکے۔اس کو''لوپ'' کہا جاتا ہے۔یہ صورت گو کہ نئی ہے جس سے بچوں کی پیدائش نہیں ہو سکتی اور زمانہ قدیم سے ہی یہ سلسلہ چلا آرہا ہے اور اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی مثال بھی ملتی ہے کہ اسلام سے پہلے لوگ عزل کیا کرتے تھے۔یعنی ہم بستری کے آخری وقت میں مادۂ تولید کو باہر نکال دینا اور اس بارے میں احادیث میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، جن احادیث سے مطلقاً جواز معلوم ہوتا ہے اور اکثر فقہاء احناف کا اسی طرف رجحان ہے۔بشرطیکہ بیوی کی رضامندی ضروری ہو۔لیکن بعض حضرات اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔اکثر فقہاء کی یہی رائے ہے اور زیادہ تر احادیث بھی ایسی منقول ہیں اور بعض احادیث سے تو بالکل حرمت معلوم ہوتی ہے۔مثلاً یہ کہ اس کو''مودت'' (بچوں کو زندہ درگور کرنا) قرار دیا گیا ہے۔بس یہ بات صحیح ہے کہ بغیر کسی عذر کے عزل کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب محض معاشی حالات کے پیشِ نظر اولاد سے بچنا مقصود ہو اور محققین اور فقہاء احناف کو بھی اس کا اعتراف ہے۔لہٰذا یہ بات درست ہے کہ بلا عذر افزائش نسل کو روکنا ناجائز ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ نے اسی مسئلہ کے ضمن میں محمد احمد علیش مالکیؒ (متوفی:۱۸۸۲ء) کی رائے کا حوالہ دیا ہے کہ حمل کی روک تھام کے لئے دواؤں کا استعمال کرنا جائز نہیں اور جب مادۂ تولید رحم میں داخل ہو جائے تو (مرد وعورت) کو یا ان میں سے کسی ایک کو ایسی دواؤں کا استعمال کرنا جائز نہیں، اور آقا (مالک) کے لئے بھی اپنی باندی کے معاملہ میں انسانی ڈھانچہ مکمل ہونے سے پہلے بھی حمل کی روک تھام کی تدابیر اختیار کرنا مشہور (مالکی) مذہب کے مطابق جائز نہیں ہے۔ (۳۰)

صاحب اسلامی طرز فکر کی رائے:

عام حالات میں حمل کی روک تھام کروانا اسلام میں سختی سے منع ہے۔یہ اسلام کی اخلاقی، معاشرتی اقدار اور قانون کے برخلاف ہے۔جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے تخلیقی منصوبہ میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔جب ایک عورت ذاتی یا معاشرتی وجہ سے یا صرف اس وجہ سے کہ وہ بچہ نہیں چاہتی، اپنا حمل ضائع کروا لیتی ہے تو دراصل وہ خالق کائنات سے کہہ رہی ہے کہ''آپ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور میں اسے روکنا چاہتی ہوں۔اس کا یہ عمل اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے خلاف بغاوت کو ظاہر کرتا ہے۔اگر کوئی شادی شدہ

جوڑا ایسا کرتا ہے تو دونوں کی حیثیت باغی کی ہوگی۔ وہ دونوں اللہ رب العلمین کی سزا کو آواز دے رہے ہیں۔ لہٰذا حمل کی روک تھام جائز نہیں۔ (۳۱)

اس مسئلہ کے ضمن میں علماء متقدمین اور متاخرین کی آراء سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے انسانی بچوں کی روک تھام کے لئے جو بھی طریقہ اپنایا جائے گا وہ ہر طرح سے ناجائز ہے۔ چاہیے کثرت آبادی یا معاشی بدحالی کی صورت کیوں نہ ہو، دور حاضر میں تو اچھے بھلے لوگ ایک خود ساختہ فارمولہ "ہم دو اور ہمارے دو" کے تحت جو طریقے بھی اپناتے ہیں وہ سب ناجائز ہے۔ اور مکمل طور پر افزائش نسل کو ختم کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ اس لئے کہ مخلوق کا پیدا کرنا اور نہ کرنا صرف اللہ پاک کی قدرت میں شامل ہے۔ اور کسی بندہ کو حق نہیں دیا کہ وہ اللہ پاک کے کاموں میں مداخلت کرتا پھرے۔

انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا شرعی حکم:

موجودہ دور کے انسان نے سائنس میں اتنی ترقی کی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کی ہیں کہ کل تک جس چیز کا تصور بھی مشکل تھا وہ آج حقیقت بن کر سامنے آرہی ہے۔

جدید تحقیقات اور انکشافات سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ اعضاء کی پیوندکاری کا مسئلہ وقت کا ایک اہم انسانی اور طبی مسئلہ ہے۔ علاج کے اس طریقے اور تنوع کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔ اس مسئلہ کا رشتہ ایک طرف انسانی کرامت کے تحفظ سے ہے کہ انسانی اعضاء واجزاء کا استعمال کرامت انسانی کے خلاف محسوس ہوتا ہے دوسری طرف بعض اوقات مریضوں کے لئے اعضاء کی پیوندکاری ہے یا اس کی کسی اہم منفعت کو لوٹایا جاسکتا ہے؟ اور شریعت نے انسانی ضرورتوں کی رعایت رکھی ہے، اس مسئلہ کے لئے دو مختلف جہتوں کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ کیا وہ قرآن وسنت کے خلاف تو نہیں؟

اکثر فقہاء حضرات نے انسانی اجزاء سے انتفاع (فائدہ) کو اسی لئے منع فرمایا ہے کہ انسان صرف خرید و فروخت کی چیز بن کر نہ رہ جائے کیونکہ یہ اس کی شان تکریم کے خلاف ہے۔

عضو کی لغوی واصطلاحی تعریف یہ بیان کی گئی ہے: "العضو: جمع اعضاء: اجزء الذی استعمل بعمل معین فی البدن (Organ)" (۳۲)

ترجمہ۔　عضو: اس کی جمع اعضاء ہے۔ وہ حصہ جسم جو کسی خاص کام کے لئے خود مختار ہو۔

لہٰذا اسی مسئلہ کے ضمن میں علماء کرام کی یہ آراء سامنے آئی ہیں:

علامہ زین الدین ابن نجیم الحنفیؒ (متوفی:۹۷۰ھ) فرماتے ہیں کہ:

"وشعر الانسان والانتفاع به ای لم یجز بیعه والانتفاع به لان کان الا ذمی غیر مبتذل فلا یجوزان یکون شئی عن اجزائه مهانا مبتذلا" (۳۳)

ترجمہ۔ انسان کے بال نہ انتفاع جائز ہے اور نہ اس کی بیع جائز ہے اس لئے کہ آدمی مکرم ہے اس کے مقابل کوئی چیز نہیں پس نہیں جائز ہے کہ اس کے اجزاء میں سے کسی جز و کو ذلیل کیا جائے یا استعمال کیا جائے۔

الامام الکبیر ابی بکر محمد بن احمد بن ابی سھلؒ المبسوط (متوفی:۴۸۳ھ) میں رقم کرتے ہیں:

"(الا تری) ان شعر الادمی لا ینتفع به اکراما للادمی" (۳۴)

ترجمہ (کیا تو نے نہیں دیکھا) انسانیت کی وجہ سے انسانوں کے بالوں سے بھی فائدہ نہیں لیا جا سکتا۔

امام علاؤالدین بن ابی بکر بن مسعود الکاسانیؒ (متوفی:۵۸۷ھ) رقم کرتے ہیں:

"(واما) النوع الذی لا یباح ولا یرخص بالاکراه اصلاً فهو قتل المسلم بغیر حق سواء کان الاکراه نا قصا اور تاماو کذاقطع عضو من اعضائه ولواذن له المکره علیه فقال للمکره افعل لا یباح له ان یفعل" (۳۵)

ترجمہ۔ اور وہ قسم جو کہ ناجائز ہوتی ہے اور نہ اس میں رخصت دی جاتی ہے مجبور کرنے سے بالکل تو وہ ناحق مسلمان کا قتل کرنا ہے برابر ہے کہ اکراہ ناقص ہو یا تام (کم یا پورا) اور اسی طرح مسلمان کے اعضاء میں سے کسی عضو کا کاٹنا اگر چہ مکروہ علیہ (جس پر مجبور کیا جائے) اس کو اجازت دے اور مکرہ (مجبور کیا ہوا) کو کہے کہ تو یہ کام کر پھر بھی اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ کرے۔

مولانا مجاہدالاسلام قاسمی فرماتے ہیں:

اضطراری حالت میں خون دینا تو جائز ہے کیونکہ خون عضو نہیں ہے اور پھر دوبارہ بھی نیا خون پیدا ہو جاتا ہے لیکن نکالے ہوئے عضو کی جگہ دوسرا عضو پیدا نہیں ہوتا مثلاً آنکھ، گردہ وغیرہ اگر نکالے جائیں تو یہ دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتے اس لئے انسانی اعضاء کی پیوندکاری ناجائز ہے۔(۳۶)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (متوفی:۱۹۷۹ء) رقم طراز ہیں کہ:

آنکھوں کے عطیہ کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں ہے، بہت سے دوسرے اعضاء بھی مریضوں کے کام آ سکتے ہیں اور ان کے دوسرے مفید اعضاء استعمال بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ دروازہ اگر اس طرح کھول دیا گیا تو مسلمان کا قبر میں دفن ہونا مشکل ہو جائے گا اور اس کا سارا جسم چندہ ہی میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔(۳۷)

مولانا محمد برھان الدین سنبھلی فرماتے ہیں:

انسان جب اپنے اجزاء واعضاء کا مالک نہیں ہے تو پھر کسی دوسرے شخص کو کسی بھی صورت اجازت نہیں دے سکتا، اگر وہ اجازت دے بھی دیتا ہے تو وہ شرعاً نا قابل اعتبار بلکہ باعث رد ہوگی۔ (۳۸)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ (متوفی: ۲۰۰۰ء) اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

اسلامی شریعت انسان اور انسانیت کی ظاہری اور معنوی صلاح وفلاح کی ضامن ہے اس کے لئے کسی حرام اور خطرناک کی طرف دیکھنا اور صرف ظاہری فائدہ کی بناء پر اس کی اجازت دے دینا ممکن نہیں، اسلام نے نہ صرف زندہ انسان کے درست اعضاء کا نہیں بلکہ کٹا ہوا یا بے کار اعضاء واجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے اور اسی طرح مردہ انسان کے بھی کسی عضو کو کاٹنا ناجائز کہا ہے اور اس معاملہ میں کسی کی رضامندی اور اجازت سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی جازت نہیں دی اور اس حکم میں مسلمان وکافر سب برابر ہیں کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے جو سب میں برابر ہے۔ انسان کے احترام کو شریعت اسلام نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ کسی حال مین بھی کسی کو انسان کے اعضاء واجزاء حاصل کرنے کی لالچ وغیرہ نہ ہو، اس طرح یہ مخدوم کائنات اور اس کے اعضاء استعمال کے کاموں سے بالاتر ہیں جن کو کاٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر غذاؤں، دواؤں اور دوسرے مفادات کے لئے استعمال کیا جائے اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ، فقہائے کرام اور پوری امت متفق ہے، اور نہ صرف شریعت اسلام بلکہ تمام مذاہب کا یہی قانون ہے۔ (۳۹)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ (متوفی ۱۹۷۶ء) رقم کرتے ہیں:

اس وقت جس انداز سے یہ کام جاری وساری ہے۔ بظاہر ان مضرتوں کی روک تھام کا انتظام کر لیا گیا ہے جو اس تماشے کے نتیجے میں پورے انسانی معاشرے کو تباہی میں ڈال سکتی ہیں کیونکہ ایسے اعضاء صرف خالص رضا کارانہ طور پر ان لوگوں سے لیے اور دیے جاتے ہیں جو اس جہاں سے گزر جاتے ہیں۔ خواہ وہ بیماری کے سبب یا سزا کے طور پر قتل ہونے کی وجہ سے لیکن دنیا کے تجربات رکھنے والے کوئی صاحب بصیرت ان عارضی پابندیوں پر مطمئن نہیں ہوسکتا۔ خدانخواستہ یہ طریقہ علاج رواج پا گیا تو اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوگا کہ غریب انسان کی آنکھیں اور گردے اور دوسرے اعضاء ایک بکاؤ مال کی طرح بازار میں بکا کریں گے۔

لہذا انسانی اعضاء کی پیوند کاری ہر طرح سے ناجائز اور حرام ہے۔ چاہے کوئی انسان اپنی رضامندی سے اپنی آنکھیں، گردہ، پھیپھڑا وغیرہ دے یا پھر ان اعضاء کو کسی مجبور بندے سے خرید کر پیوند کاری کرنا ناجائز ہے۔ اس لیے کہ انسان اپنے جسم کے اعضاء کا مالک نہیں ہے کہ وہ اس کو تقسیم کرتا پھرے۔ (۴۰)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی انسانی اعضاء کی پیوند کاری کے ضمن میں درج ذیل آراء بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اعضاءانسانی کے لئے جو طبعی طریقہ ایجاد ہوا ہے اس میں توہین انسانیت نہیں ہے۔

۲۔ پیوند کاری کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس کا مقصد صرف مریض کی جان بچانا لازمی ہو یا کسی مریض کی جسمانی منفعت کو لوٹانا ہو جیسے آنکھوں کی بینائی وغیرہ۔

۳۔ طبیب حاذق (ماہر) نے یہ بتایا ہو کہ اس وجہ سے صحت یابی مکمل طور پر مل سکتی ہے۔

۴۔ غیر مسلم کے اعضاء بھی مسلمان کے جسم میں لگائے جا سکتے ہیں۔

۵۔ مردہ شخص کے جسم سے عضو لیا جا سکتا ہے اگر زندگی میں اس نے اجازت دی ہو اس لئے کہ وہ جسم کا مالک ہے نیز اس کے خاندان والوں کا اس کے لئے راضی ہونا ضروری ہے۔

۶۔ زندہ شخص کا عضو لیا جا رہا ہو تو ضروری ہوگا کہ خود اس نے اجازت دی ہو اور اس وجہ سے اس کو اپنی جان وغیرہ کا خطرہ نہ ہو۔

۷۔ اعضاء کی بینکنگ بھی درست ہے، شوافع اور حنابلہ کے یہاں اعضاء کی خرید فروخت دونوں کی گنجائش ہے اور احناف کے نزدیک بدرجہ مجبوری خرید سکتے ہیں، فروخت نہیں کر سکتے۔(۴۱)

ان تمام آراء کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا خالد سیف اللہ نے مذکورہ مسلہ کے ضمن میں جو آراء دی ہیں وہ ذاتی اعتبار سے مختلف ہے کیونکہ تمام علماء کرام نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت ہی اعلیٰ مخلوق بنایا ہے اور اس نے انسان کی زندگی کو آسودہ بنانے کے لئے تمام کائنات و مخلوقات سے اپنی خدمت اور کام لینے کا حق دیا ہے۔ بہت سے جانوروں کے دودھ سے لے کر گوشت پوست اور ہڈی وغیرہ سب چیزیں انسان کے لئے جائز قرار دی ہیں، جہاں تک انسان کی جان کی حفاظت کا تعلق ہے تو اس کے لئے بھی طرح طرح کی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں خاص کر بہت ہی مجبوری کی صورتوں میں تو حرام چیزوں کے استعمال کی بھی گنجائش رکھی ہے۔ جہاں تک انسان کے اعضاء کا تعلق ہے کہ ایک جسم کے اعضاء کو نکال کر دوسرے جسم میں لگانا زیادتی کے مترادف ہے کیونکہ انسان اپنے جسم کا مالک نہیں، مالک صرف اللہ کی ذات ہے اس لئے انسان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کے اعضاء کو تقسیم کرتا پھرے۔ تاہم نباتات و حیوانات وغیرہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

تصویر کی شرعی حیثیت:

تصویر کی بابت قدماء علماء اور فقہا کا رویہ سختی پر مبنی تھا کیونکہ کہ اس سے بت پرستی کا خطرہ ہوتا ہے۔ تصویر

بنانا صرف اسی کا نام نہیں ہے کہ قلم سے تصویر بنائی جائے یا کیمرے کی آنکھ سے تصویر کھنچوائی جائے یا پھر کسی پتھر یا لکڑی کو تراش کر کے بت وغیرہ بنایا جائے' بلکہ اس میں وہ تمام صورتیں تصویر کشی میں داخل ہیں جن کے ذریعے تصویریں تیار ہوتی ہیں چاہے وہ پرانے آلات سے ہوں یا جدید آلات سے تیار کی جائیں تو شرعی احکام کا تعلق مقصد سے ہوتا ہے۔

تصویر کو عربی زبان میں "الصورۃ" کہتے ہیں۔

الصورة : فی الغة شکل ، و فی اصطلا ح: "نقش صورة الاشباه أو الاشخاص علی لوح او حامط او نحوهما جمعة التصاویر"۔ (۴۲)

ترجمہ۔　صورۃ کولغت میں شکل کہتے ہیں، اور اصطلاحی معنی یہ ہے کہ کسی نقش کی تختی جس پر اشیاء یا اشخاص کی تصویر ہو، تختی پر یا دیوار یا اُن جیسی چیزوں پر اس کی جمع ہے تصاویر۔

اس مسئلہ کے ضمن میں علماء کرام نے یہ آراء دی ہیں:

عبدالرحمٰن الجزیریؒ (متوفی:۱۹۴۱ء) بیان کرتے ہیں کہ:

اگر نمازی کے سامنے کسی جاندار کی تصویر وغیرہ ہو کہ انسان کی توجہ اس طرف سے ہٹ جائے یا اگر توجہ نہ ہٹے تو نماز مکروہ نہ ہوگی۔ مالکیہ، شافعیہ کے نزدیک یہی حکم ہے۔ لیکن حنفیہ اور حنابلہ کے مسالک کے نزدیک یہ ہے کہ کسی جاندار کی تصویر کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ خواہ اسکی طرف توجہ جاتی ہو یا نہ جاتی ہو۔ یہ تصویر خواہ نمازی کے سر کے اوپر ہو یا آگے ہو' پیچھے ہو' دائیں ہو یا بائیں۔ نہایت شدید کراہت اس میں ہے کہ تصویر نمازی کے آگے ہو۔ ہاں باقی اطراف میں کم مکروہ ہے۔ ہاں اگر تصویر کافی چھوٹی ہو کہ غور سے دیکھے بغیر نظر نہ آئے جیسا کہ سکہ پر ہوتی ہے تو وہ مکروہ نہیں ہوتی۔ اگر نمازی کے پاس تصویر والے سکے ہوں تو نماز مکروہ نہیں ہوتی۔ ہاں اگر بڑی تصویر سر کٹی ہو تو پھر بھی نماز مکروہ نہیں ہوگی۔ وگرنہ ہر تصویر کے سامنے نماز مکروہ ہوتی ہے۔ (۴۳)

ثناء اللہ امرتسریؒ (متوفی:۱۹۴۳ء) رقم کرتے ہیں کہ:

تصویر کا رکھنا اور اس کو فروخت کرنا مسلمانوں کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے۔ (۴۴)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ رقم طراز ہیں کہ:

جو شبہات تصویر کے عدم جواز پر کئے جاتے ہیں اور دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ فوٹو عکس نہیں، عکس ایک عرض ہے لیکن اس پر کسی قسم کا مسالہ وغیرہ لگا دیا جائے تو اس کا حکم استقلال کا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ مجسمے کے حکم میں ہوگا۔ لیکن ضرورت شدیدہ کے وقت اجازت ہوگی جیسے حج وغیرہ کے کاغذات تیار کرانے کے لئے تصویر کی ضرورت ہوتی

ہے۔ (۴۵)

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ (متوفی: ۱۳۷۲ھ) فرماتے ہیں کہ:

تصویر کھینچنا اور کھنچوانا دونوں ناجائز ہیں۔خواہ دستی (ہاتھ سے بنی ہوئی) ہو یا عکسی (کیمرے سے بنی ہوئی) ہو دونوں کا ایک ہی حکم ہے تصویر خواہ انسان کی ہو یا حیوان کی ہو، مکانات کے نقشے، درختوں کی تصویریں ناجائز نہیں ہیں۔جدید تحقیق سے درختوں میں جس قسم کی زندگی دریافت ہوئی ہے وہ انسان اور حیوان کی زندگی سے مختلف ہے۔لہٰذا درختوں، پہاڑوں اور دیگر نباتات وغیرہ کی تصاویر حرام نہیں ہیں۔ (۴۶)

سید ابوالاعلیٰ مودودی فوٹو (تصویر) کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

کہ فوٹو کے متعلق یہ بات جان لینی چاہیے کہ اسلام جاندار چیزوں کی مستقل شبیہہ محفوظ کرنے کو بالعموم روکنا چاہتا ہے کیونکہ تاریخ انسانی کا طویل تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز اکثر فتنہ کی موجب بنی ہے۔اسکا طریقہ خواہ سنگ تراشی کا ہو یا قلم یا عکاسی یا کوئی اور جدید ایجاد ہو بہر حال وہ ناجائز ہی رہے گا۔کیونکہ یہ سارے طریقے اس فتنہ کا سبب بننے میں یکساں ہیں۔پس فوٹو گرفی اور مصوری میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا اور ممانعت چونکہ جاندار اشیاء کی تصویروں کی ہے اس لئے تمام تصویر حرام ہی رہیں گی، خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔سید مودودیؒ نے اس ضمن میں یہ ضرور کہا ہے کہ اگر تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو یا جبکہ تصویر کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لئے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہے۔مثلاً پاسپورٹ/ پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لئے تصویریں محفوظ کرنا یا جنگی مقاصد کے لئے فوٹو گرافی کا استعمال وغیرہ کرنا مجبوراً جائز ہے۔(۴۷)

مولانا عبدالحقؒ (متوفی: ۱۹۹۸ء) وغیرھما مفتیان دارالعلوم حقانیہ) بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

جب ذی روح اشیاء کی تصاویر اُتارنا اور اس کو دیکھ کر لطف اندوز ہونا حرام ہے تو پھر اجنبی عورتوں کی تصاویر دیکھ کر لطف اندوز ہونا تو بعینہٖ اس خاتون کو دیکھنے کے مترادف ہے جو سراسر ناجائز اور حرام ہے۔لہٰذا تصویر کشی قطعی طور پر ناجائز ہے۔(۴۸)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ (متوفی ۲۰۰۰ء) رقم طراز ہیں کہ:

قانونی مجبوری کی وجہ سے جو فوٹو بنوائے جاتے ہیں وہ مجبوری کی وجہ سے تو لائق معافی ہو سکتے ہیں لیکن جو کام شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لعنت قرار دی گئی ہو تو اسلامی حکومت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ان کاموں کی تشہیر کرے، دوسرے یہ فوائد محض وہمی ہیں واقعی نہیں، جب یہ فوٹو کی لعنت قوم پر مسلط نہیں تھی۔

اس وقت اتنی جعلسازیاں اور بے ایمانیاں نہیں ہوتی تھیں جتنی اب ہوتی ہیں۔لہٰذا تصویر کشی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ (۴۹)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی رقم کرتے ہیں کہ:

کسی زندہ انسان کا مجسمہ بنانا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے۔اور ایسی تصویریں بنانا بھی ناجائز ہے جن سے کوئی قوم وغیرہ پرستش کرے جیسے گرونانک اور ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق کرشنا رام جی یا پھر عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ کی تصاویر وغیرہ۔ہاں جہاں تصویر ایک ضرورت بن جائے مثلاً دفاعی مقاصد کے پیشِ نظر تصویر لی جائے، پولیس اسٹیشن میں غنڈہ اور شریر لوگوں کی پہچان یا ریلوے سٹیشن بسوں اور ہوائی اڈوں پر شناخت کے لئے تصویر درکار ہو تو ان تمام صورتوں میں تصویر بنانا درست ہے۔ (۵۰)

المختصر یہ کہ شریعت کی رو سے تصویر کا رکھنا یا اتروانا شریعت اسلام نے منع فرمایا ہے اور بغیر کسی امر مجبوری کے ناجائز ہے۔دراصل آجکل تصویر کشی بہت عام ہوگئی ہے۔مردوں کے علاوہ عورتوں کی بھی تصاویر اترنے لگی ہیں اور پھر ان سے بہت سے غلط مقاصد حاصل کئے جانے لگے ہیں۔یہ اب ایک قسم کی تجارت بن گئی ہے۔فوٹو کے ذریعے بلیک میلنگ، عریانی اور فحاشی سے پورے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔اسی لئے تو شریعت اسلام کی رُو سے علماء کرام نے قرآن وحدیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ تصویر یا فوٹو کھینچنا اور کھنچوانا دونوں ناجائز ہیں۔بعض علماء نے ضرورت کے پیشِ نظر چار قسم کی تصویروں کو شرعاً جائز قرار دیا ہے۔

۱۔ سرکٹی ہوئی۔یہ کہ وہ تصویر جس کی شناخت نہ ہو سکے۔

۲۔ وہ تصاویر جو پامال وذلیل ہو اور ان کی تکریم کی جائے۔

۳۔ تصویر اتنی چھوٹی ہو کہ اس کی مکمل شناخت نہ ہو سکے۔

۴۔ اس بات پر تمام مقدمین اور متاخرین متفق ہیں کہ غیر ذی روح چیزوں کی تصاویر جائز ہے۔

بندوق سے کیا ہوا شکار جائز ہے یا ناجائز:

شکار کرنا آج کی بات نہیں ہے بلکہ یہ دورِ قدیم سے چلا آرہا ہے کہ انسان کسی بھی جانور کو چاہے وہ زمین پر دوڑنے والا ہو یا ہوا میں اُڑنے والا اس کا شکار کرتا ہے۔اس کے لئے مختلف ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔جیسا کہ بعض شکار کو شکاری جانوروں سے کیا جاتا ہے۔اور بعض شکار انسان اپنے بنائے ہوئے تیر کمان، بندوق، غلیل اور نیزے کے ذریعے سے کرتا تھا،لیکن اب چونکہ زمانہ کافی تبدیل ہو گیا ہے نئے نئے آلات وجود میں آ گئے ہیں اور ان میں زیادہ تر شکار بندوق کے ذریعے کیا جاتا ہے اور ایسا کرنے سے شکار جائز اور حلال ہے۔

شکار کو عربی زبان میں الصید کہتے ہیں:

الصید کی لغوی تعریف یہ کی گئی ہے: ماتو حش بجناحه أو بقوائمه ماكولا كان او غير ما كول ولا يوخذ الا بحيلة" (۵۱)

ترجمہ۔ کہ پرندے کا شکار کرنا شرعاً اس سے ایسی چیز مراد ہے جو اپنے پاؤں اور ٹانگوں کے ساتھ لوگوں سے بدکنے والا ہو۔

تو اس ضمن میں علماء کرام نے جو آراء دی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

عبدالرحمٰن الجزیریؒ (متوفی: ۱۹۴۱ء) کی تصنیف کتاب الفقہ میں شکار کے مسائل واحکام کے ضمن میں لکھا گیا ہے کہ:

آلاتِ شکار دو قسم کے ہیں: (۱) بے جان آلات (۲) جاندار آلات

بے جان آلات میں شکاری کا نیزہ، تیر اور بندوق ہے۔ اور جاندار آلات میں وہ شکاری جانور جن کو سدھایا گیا ہو یعنی چیتا، تیندوا، شیر، کتا اور پرندوں کے شکار کے لئے شاہین وغیرہ، بے جان آلات سے مارے ہوئے شکار کے بارے میں ہے کہ جانور آلہ کی دھار یا نوک سے مرا ہو، جیسے چھری، تلوار، نیزہ یا تیر تو ان سے کیا ہوا شکار حلال ہوگا۔ اور اگر پتھر یا چوٹ لگنے سے مارا ہوا شکار حلال نہ ہوگا، اس طرح بندوق کی گولی یا چھرے سے مرا ہوا جانور حلال نہ ہوگا، اگر کسی جانور نے گولی کا زخم برداشت کرلیا مثلاً کوئی بڑا جانور ہے اور زخم کھا کر بھی زندہ رہا اور اس کو ذبح کرلیا گیا تو وہ حلال ہوگا، غرض بندوق سے کیا ہوا شکار کرنا اور اس کا کھانا جائز ہے۔ جبکہ شکاری واقف کار ہو اور حیوان گولی کھا کر زندہ رہا اور اسے ذبح کرلیا گیا تو ایسا شکار جائز ہے۔ (۵۲)

سید عبدالرحیم لاجپوری (متوفی: ۱۹۱۹ء) رقم کرتے ہیں کہ:

اگر شکاری بندوق کی گولی سے کوئی شکار کرتا ہے تو اس جانور کو ہلاک ہونے سے پہلے ذبح کرنا شرط ہے اور اگر وہ بندوق کی گولی سے ہلاک ہوگیا اور ذبح نہیں کیا گیا اور (شکار چاہے چھوٹا جانور ہو یا بڑا جانور) تو وہ حلال نہیں ہوگا، کیونکہ گولی میں دھار نہیں ہے اور جانور گولی کی مار اور جلن سے مرتا ہے۔ (۵۳)

مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی: ۱۹۴۳ء) رقم کرتے ہیں کہ:

ویسے تو بندوق سے شکار کرنا جائز ہے لیکن بندوق کی گولی اگر جانور کے اندر پھٹی ہو یا نہ پھٹی ہو تب بھی وہ قاتل ہوتی ہے۔ اس لئے اس دھار طرف زہوق روح کو منسوب نہ کریں گے۔ (یعنی اس کے لگنے سے نکلی ہوئی روح کو حلال نہیں سمجھیں گے) جب تک اس کو مرنے سے پہلے ذبح نہ کرلیا جائے۔ (۵۴)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے بندوق کی نوک دار گولی کے ذریعے شکار کرنے کے متعلق یہ سوال پوچھا گیا کہ:

اگر شکاری کسی لوہے کے آلہ جو کہ باریک ہے اور اس کو ہوائی بندوق میں رکھ کر چھوڑتا ہے اور چھوٹے پرندوں سے لے کر چیل، خرگوش کو مار لیتی ہے اس چیز سے اگر بسم اللہ یا اللہ اکبر کہہ کر شکار کیا جائے اور اس سے شکار مر جائے اور اتفاق سے وہ ذبح نہ کیا جا سکے تو کیا وہ حلال ہوگا؟

مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ پوچھے گئے سوال سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو آلہ تیر کی طرح زخم کھولتا ہے بندوق کی عام گولی اور چھروں کی طرح جسم کو کوٹتا نہیں تو لہٰذا اس کا حکم تیر ہی کا حکم ہے اور اس کو چھوڑتے وقت بسم اللہ یا اللہ اکبر کہا گیا اور شکار اس سے مر گیا تو یہ شکار حلال ہے۔(۵۵)

مولانا کفایت اللہ دہلویؒ (متوفی:۱۳۷۲ھ) رقم کرتے ہیں کہ:

اگر بندوق سے کسی مچھلی وغیرہ کا شکار کیا جائے تو جائز ہے اور حلال ہے اور ممانعت کی کوئی وجہ نہیں (۵۶)

مولانا سید ابو اعلیٰ مودودیؒ (متوفی ۱۹۷۹ء) اس مسئلہ پر واضح انداز میں اپنا موقف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

بندوق کی گولی کو غلیل کے ٹھنڈے غلے پر قیاس کرنا اور اس کی بناء پر یہ سمجھنا کہ اس سے جو جانور مر جاتا ہے وہ دراصل اس طرح کی چوٹ کھا کر مرتا ہے جیسی پتھر یا لکڑی کے عرض سے لگتی ہے، صحیح نہیں، گولی جس وقت بندوق سے نکلتی ہے اور پھر جس رفتار کے ساتھ وہ بندوق سے نشانہ تک تقریباً (500 گز فی سیکنڈ) راستہ طے کرتی ہے اس بناء پر وہ کوئی ٹھنڈا سنگریزہ نہیں رہتی بلکہ اچھی خاصی نرم اور تقریباً نوکدار ہو کر جسم کو چھیدتی ہوئی اس میں گھستی ہے اور پھر اس سے خون بہہ کر جانور مرتا ہے یہ عمل شکاری جانور کے ناخنوں اور کچلیوں اور معراض یا لکڑی کی میخ کا سرا چبھنے سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں ہوتا بلکہ خون بہانے میں بعید نہیں کہ ان سے زیادہ ہی کارگر ہو، سید مودودی آخر میں رقم کرتے ہیں کہ اگر اللہ کا نام لے کر بندوق چلائی جائے اور نکلی ہوئی گولی یا چھرے سے جانور مر جائے تو اس کے حلال ہونے میں کوئی وجہ نہیں یعنی کہ اس شکار کا گوشت کھانا جائز اور حلال ہے۔ (۵۷)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ (متوفی:۲۰۰۰ء) رقم کرتے ہیں کہ:

حلال جانور پر تکبیر پڑھ کر بندوق سے شکار کیا گیا اور مر گیا تو حلال نہیں لیکن اگر زخمی حالت میں ذبح کر لیا گیا تو وہ حلال ہے۔(۵۸)

خالد سیف اللہ رحمانیؒ بیان کرتے ہیں کہ:

ویسے تو فقہاء نے عام طور پر اسکو حرام قرار دیا ہے اور اسکی مثالیں فقہاء متقدمین اور متاخرین کی کتابوں

میں موجود ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں جو بارودی گولیاں تیار ہوتی ہیں وہ کسی دھار دار سے بھی بہتر طریقہ پر جسم کا خون بہا دیتی ہیں اور پارہ پارہ کر دیتی ہیں اور شریعت کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ خون اچھی طرح بہہ جائے۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ بندوق کی موجودہ وضع آلہ شکار کے لئے شریعت کی مطلوبہ شرط کو پورا کرتی ہے۔ لہٰذا بندوق سے کیا ہوا شکار جائز ہے۔ (۵۹)

مولانا عبدالحق ؒ (متوفی:۱۹۹۸ء) لکھتے ہیں:

جو چیز جارحانہ ہو بلکہ زور سے شکار کو زخمی کر دے اور وہ اس سے مر جائے تو یہ موقوذہ کے حکم میں آجاتا ہے، لہٰذا یہ حلال نہیں ہے کیونکہ بندوق اور غلیل کی گولی خود جارحہ نہیں بلکہ عموماً جانور اس کے زور سے زخمی ہو جاتا ہے اس لئے اس کی حلت کے لئے یہ جرح کافی ہے نہیں ہاں اگر اس میں جان باقی ہو تو ذبح کر لینے سے حلال ہے۔ (۶۰)

علماء کرام کی تحقیق حلال مذبوح ہونے کی شرائط میں اختلاف ہے، بعض کے نقطہ نظر کے مطابق بندوق کی گولی تیر کی طرح ہے اور بعض کے نزدیک اس کا اثر کسی وزن دار شے کی ضرب کا سا ہے ان نقطہ ہائے نظر کی وجہ سے بعض علماء کرام اس شکار کو حلال کرار دیتے ہیں بعض کے نزدیک اس کا حلال ہونا مشتبہ ہے۔

CONCLUSION

یہ وہ چند منتخب مسائل تھے جن میں سے بعض کی بناء قدما کی تحقیقات میں بھی پائی جاتی ہیں اور بعض زمانی ترقی سے پیش آنے والی مسائل ہیں جن کی نظیر قدیم علماء کے ہاں نہیں ملتی، فقہا قدما کے ساتھ ساتھ عصر حاضر میں بھی علم فقہ پر کام جاری ہے اور محققین علماء کرام ان سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن وسنت کی بنیادوں پر اپنی تحقیقات بھی پیش کرتے ہیں۔ اور ہر صاحب علم نے شریعت کے اصولوں کے تحت پیش آمدہ مسائل کا استنباط کیا ہے۔ چونکہ فکر انسانی متحرک شئے ہے۔ اس لئے ان تحقیقات میں اختلاف بھی ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ تھانویؒ محمد اعلیٰ، قاضی (ت:۱۱۹۱ھ) کشاف اصطلاحات الفنون،، سہیل اکیڈمی، لاہور،۱۹۹۳ء، ج اول، ص ۶۵۵

۲۔ لدھیانوی، رشید احمد، مفتی، مولانا، احسن الفتاوی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، (س،ن)، ج ۴، ص ۹۰

۳۔ محمد شفیع، مفتیؒ، مولانا، جواہر الفقہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید ۲۰۰۴ء، ج اول، ص ۴۳۸

۴۔ گنگوہیؒ، عبدالرشید مولانا، (ت:۱۹۰۵ء)، فتاویٰ رشیدیہ، اسلامی کتب خانہ، کراچی: (س ن)، ص ۴۱۴

۵۔ عثمانی، عزیز الرحمٰن، مفتی، مولاناؒ (ت:۱۳۴۷ھ)، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۱ھ، ج ۱، ص ۱۷۱

۶۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا، جدید فقہی مسائل، اُردو بازار لاہور، ۱۴۰۴ھ،، ج ۱، ص ۵۹

۷۔ صدیقی، محمد احسن، مولانا، (مترجم) احسن المسائل، ترجمہ کنزل الدقائق، ایچ ایم سعید کمپنی، اردو بازار لاہور، پاکستان (س،ن)،، ص ۵۲

۸۔ عبدالحیؒ، ابی الحسنات، مولانا (ت:۱۳۰۴ھ) مجموعہ الفتاویٰ، مترجم مفتی محمد برکت اللہ لکھنوی)، ایچ ایم سعید کمپنی اُردو منزل کراچی، ۱۴۱۹ھ، ص ۱۶۵

۹۔ امرتسری، ثناء اللہ، ابوالوفا، مولاناؒ (ت:۱۹۴۳ء) فتاویٰ ثنائیہ، اسلامک پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۷۲ء، ج اول، ص ۶۰۱

۱۰۔ لدھیانوی، رشید احمد، مفتی، مولانا، احسن الفتاوی، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، (س،ن)، ج ۴، ص ۹۰

۱۱۔ سنبھلی، برھان الدین، مولانا، جدید مسائل کا شرعی حل، ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور، نیو طبع ۲۰۰۰ء،، ص ۳۱

۱۲۔ تھانوی، اشرف علی، مولانا، (ت:۱۹۴۳ء) امداد الفتاوی، مکتبہ دارلعلوم، کراچی ۱۳۷۹ھ،، ج ۱، ص ۳۹۵

۱۳۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا، جدید فقہی مسائل، اُردو بازار لاہور، ۱۴۰۴ھ،، ج ۱، ص ۵۰

۱۴۔ محمد شفیع، مفتیؒ، مولانا، جواہر الفقہ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، طبع جدید ۲۰۰۴ء،، ج اول، ص ۴۳۸

۱۵۔ الجرجانی، علی بن محمد، السید، شریف، (ت:۸۱۶ھ) التعریفات، دارالمنار، للطباعۃ والنشر (س ن)، ص ۹۷

۱۶۔ تھانوی، اشرف علی، مولانا، امداد الفتاویٰؒ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، (س ن)، ج ۲، ص ۱۴۵

۱۷۔ محمد شفیع، مفتی، مولانا، آلاتِ جدیدہ، ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۳

۱۸۔ لاجپوریؒ، عبدالرحیم، سید، مولانا، (ت:۱۹۱۹ء) فتاویٰ رحیمیہ، دارالاشاعت اُردو بازار کراچی، نیو طبع ۲۰۰۳ء، ج ۷۔۸، ص ۲۵۷

۱۹۔ مفتی محمودؒ، مولانا، (ت: ۱۹۸۰ء) فتاویٰ محمودیہ، جامعہ قاسم العلوم ملتان، طبع اول، ۲۰۰۰ء، ج ۳، ص ۴۸۹

۲۰۔ لدھیانویؒ، محمد یوسف، مولانا، (ت:۲۰۰۰ء) آپ کے مسائل اور ان کا حل، مکتبہ لدھیانوی، کراچی، ج ۳، ص ۲۸۵

۲۱۔ مہربان علی، مفتیؒ، مولانا، جامع الفتاویٰ، ادارہ تالیفات اشرفیہ، چوک فوارہ ملتان، ج ۵، ص ۳۱۸

۲۲۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا، جدید فقہی مسائل، بیکن بک لینڈ، اُردو بازار لاہور، ۱۴۰۴ھ، ج اول، ص ۸۴

۲۳۔ امام ابن منظور، جمال الدین، محمد بن مکرم، افریقی، علامہ (ت: ۷۱۱ھ) لسان العرب،، نشر الادب الحوزہ قم ایران، ۱۴۰۵ھ،، ج ۸، ص ۱۶

۲۴۔ علامہ سرخسی، محمد بن احمد، ابی بکر سھلؒ، (ت: ۴۸۳ھ) المبسوط، ادارۃ القرآن والعلوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۸۷ء ج

۲۶/۲۵،ص ۸۷

۲۵۔ امام محمد غزالیؒ (ت: ۵۰۵ھ)، حجۃ الاسلام، مذاق العارفین، ترجمہ (احیاء العلوم الدین)، مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور، (س ن)، ج۲ص ۶۰

۲۶۔ محدث دہلویؒ، شاہ ولی اللہ، حضرت (ت: ۱۱۷۶ھ) حجۃ اللہ البالغہ، (مترجم مولانا عبدالرحیم) الفیصل ناشران وتاجران کتب اُردو بازار لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۳۲۲

۲۷۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سیدؒ، مولانا (ت: ۱۹۷۹ء) رسائل ومسائل، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور، ۱۹۶۵ء، حصہ سوم ص ۲۹۳

۲۸۔ سنبھلی، برھان الدینؒ، مولانا، جدید مسائل کا شرعی حل، ادارہ اسلامیات، انارکلی لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۲

۲۹۔ لدھیانوی، محمد یوسف، مولانا (ت: ۲۰۰۰ء) آپ کے مسائل اوران کا حل، کراچی، ۱۹۹۹ء، ج ۷، ص ۳۵۷

۳۰۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا، جدید فقہی مسائل، لاہور، ۱۴۰۴ھ، ج اول ص ۱۵۷۔۱۵۹

۳۱۔ چغتائی، حکیم، مترجم ، اسلامی طرزفکر، (APKAR)، ایم اے جناح روڈ کراچی، ۱۹۹۹ء، ج ۲ص ۲۹۱

۳۲۔ قلعہ جی، محمد رواس، ڈاکٹر وقنیبی، حامد صادق، ڈاکٹر معجم اللغۃ الفقہاء (عربی، انگریزی)، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ص ۳۱۵

۳۳۔ علامہ زین الدین ابن نجیم الحنفی، (ت: ۹۷۰) البحرالرائق، سعید اینچ، کراچی، ۱۹۱۰ء، ج ۵/۶: ص ۸۱

۳۴۔ امام السرخسی، ابی بکر محمد بن احمد بن ابی سھل، (ت: ۴۸۳ھ)، المبسوط، کراچی، جلد ۱۵، ۱۶، ص ۱۲۵

۳۵۔ امام علاوالدین ابی بکر بن مسعود الکاسانی، (ت: ۵۸۷ھ) البدائع والصنائع سعید اینچ ایم کمپنی، کراچی، ۱۹۱۰ء، ج ۷: ص ۱۷۷

۳۶۔ مولانا مجاہد السلام قاسمی، جدید فقہی مباحث، ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، کراچی، ۱۴۰۹ھ ص ۱۹۵

۳۷۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، سید، مولانا، رسائل ومسائل، اسلامک پبلشرز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۵ء،: ج ۳: ص ۲۹

۳۸۔ سنبھلی، محمد برھان الدین، مولانا، جدید مسائل کا شرعی حل، ادارہ اسلامیات، لاہور نیو طبع ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۲

۳۹۔ لدھیانویؒ محمد یوسف، مولانا (ت: ۲۰۰۰ء) آپ کے مسائل اوران کا حل: مکتبہ لدھیانوی، کراچی، ۱۹۹۹ء ج ۹۔ص ۱۷۷

۴۰ محمد شفیع، مفتی، مولانا، انسانی اعضاء کی پیوندکاری، ادارۃ الاشاعت، کراچی، پاکستان، ۱۳۸۷ھ، ص ۱۳

۴۱۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا، جدید فقہی مسائل، اردو بازار لاہور، ۱۴۰۴ھ، ج ۲، ص ۴۰۷

۴۲۔ ابوحبیب، سعدی، القاموس الفقہی، ادارۃ القرآن والعلوم اسلامیہ (V.G۴۳۷) کراچی (س ن)، ص ۲۱۸

۴۳۔ الجزیریؒ، عبدالرحمٰن، کتاب الفقہ (علی المذاہب اربعہ)، علماء اکیڈمی شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف لاہور، ۱۹۸۳ء ج اول، ص ۲۳۹

۴۴۔ امرتسریؒ، ثناء اللہ، ابوالوفا، مولانا، فتاویٰ ثنائیہ، اسلامک پبلشنگ ہاؤس روڈ لاہور، ۱۹۷۲ء، ج اول ص ۴۰۳

۴۵۔ محمد شفیعؒ، مفتی، مولانا، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، (امدادالمفتین) دارالاشاعت، کراچی، مئی ۲۰۰۱ء، ج دوم ص ۸۲۴

۴۶۔ کفایت للہ، مفتی، مولانا، (ت ۱۳۷۲ء) کفایت المفتی، مکتبہ امدادیہ ملتان، (س ن)، ج ۹، ص ۲۳۴

۴۷۔ مودودیؒ، ابوالاعلیٰ، سید، مولانا، رسائل ومسائل، اسلامک پبلشرز، لاہور، نیو طبع ۱۹۹۸ء، ج اول ص ۱۱۹

۴۸۔ عبدالحق، مولانا، (ت: ۱۹۹۸ء) فتاویٰ حقانیہ، ودیگر مفتیان، جامعہ دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک نوشہرہ، ۱۴۲۲ھ، ج دوم، ص ۲۲۸

۴۹۔ لدھیانوی، محمد یوسف، مولانا، آپ کے مسائل اوران کا حل، مکتبہ لدھیانوی، کراچی، مارچ ۱۹۹۹ء، ج ۷، ص ۶۰

۵۰۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا، جدید فقہی مسائل، اُردو بازار لاہور، ۱۲۰۲ھ، ج اول، ص ۱۹۷

۵۱۔ جرجانی، سید شریف حنفیؒ، التعریفات، دارالمنارالطباعۃ والنشر (س ن)، ص ۹۷

۵۲۔ الجزیریؒ، عبدالرحمٰن، علامہ (ت: ۱۹۴۱ء) کتاب الفقہ، (علی مذاہب اربعہ)، مترجم: منظور احسن عباسی)، علماء اکیڈمی شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف لاہور، ۱۹۸۳ء، ج دوم، ص ۴۷

۵۳۔ لاجپوریؒ، عبدالرحیم، سید، مولانا، فتاویٰ رحیمیہ، مکتبہ رحمانیہ لاہور، (س۔ن)، ج ۵۔۶، ص ۲۷۶

۵۴۔ تھانوی، شرف علیؒ، مولانا امدادالفتاویٰ، مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۴۰۶ھ، ج ۳، ص ۶۱۹

۵۵۔ محمد شفیع، مفتی، مولانا، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند (امدادالمفتین)، ادارہ معارف کراچی، ۱۳۸۴ھ، ج دوم، ص ۳۵۷۔۳۶۷

۵۶۔ کفایت اللہ، مفتی، مولانا، کفایت المفتی، ج ۳، ص ۶۱۹

۵۷۔ مودودیؒ، ابوالاعلیٰ، سید، مولانا، رسائل ومسائل، اسلامک پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۵۸۔ لدھیانوی، محمد یوسفؒ، مولانا آپ کے مسائل اوران کا حل، مکتبہ لدھانوی، کراچی، ۱۹۹۷ء، ج چہارم، ص ۲۴۰

۵۹۔ رحمانی، خالد سیف اللہ، مولانا، حلال وحرام، زمزم پبلشرز، دارالاشاعت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۱

۶۰۔ عبدالحق، مولانا فتاویٰ حقانیہ، ودیگر مفتیان کرام، جامعہ دارالعلوم حقانیہ، نوشہرہ، ۱۴۲۳ھ، ج ششم، ص ۴۵۹